ضرورت محسوس نہیں کی کہ بعض اوقات ناگفتنی، گفتنی کی جگہ سنبھال لیتی ہے اوران کہی، کہی کے قائم مقام ہو جاتی ہے۔

''جامعہ نامہ'' کے صفحہ ۱۳۸ پر اپنے ایک بصیرت افروز مضمون ''اچھے استاد کے نمایاں اوصاف'' کا اختتام شیخ صاحب ان جھنجھوڑنے والے الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''استاد خود کو پیغمبروں کی میراثِ معلّمی کے وارث کہتے ہیں، لہٰذا انہیں معلمِ انسانیت وفخرِ انسانیت کے اسوہ حسنہ سے راہنمائی حاصل کر کے اپنی کردار سازی کرنا ہے۔ پیغمبروں کے وارث ہونے کا دعوے دار استاد ہی اگر سیرتِ طیبہ کا پیروکار نہ رہا تو اس سے بڑا گستاخ رسول کون ہو سکتا ہے؟''

شیخ عبدالرشید کا تنقیدی شعور ان کی بالغ نظری کا آئینہ دار ہے اور اس میں لمحہ گزراں سے گریز کے بجائے تفہیم و تنقیح پر مبنی تخلیقی اپج پائی جاتی ہے جس کا اظہار موصوف نے ڈاکٹر محمد نظام الدین کے مقالہ ''عالمی امن کے فروغ میں اہلِ قلم کا کردار'' کا جائزہ لیتے ہوئے صفحہ ۱۴۳ پر کچھ اس طرح کیا ہے:

> ''آج کا عہد پریشاں نظری کا عہد ہے۔ پراگندگی کا فشار وجودِ حیات کو پھاڑ دینے کو ہے۔ ہر سمت آگ اور دھواں ہے، خون جل رہا ہے، نفرت وعناد کی بد بو پھیلی ہوئی ہے۔ سرفرازی وسربلندی صرف انہی کو حاصل ہے جو لاشوں پر کھڑے ہیں۔.... ایسے میں کھربوں ڈالرز کے ہیبت ناک اسلحے کی طاقت سے عالمی امن مسلط کیا جا رہا ہے، ایک ایسا امن جس کا تحفظ سٹار وار سسٹم کرے گا جو گلوبل مارکیٹ کو پروان چڑھائے گا جہاں ہر چیز بکے گی، کتاب بھی اور قلم بھی، ادب بھی اور نظریہ بھی۔ انسان وہی سوچے اور سمجھے گا جیسا اس سے چاہا جائے گا۔''

''جامعہ نامہ'' کے مزید کئی پہلوؤں پر بات ہو سکتی ہے، لیکن اس مختصر تبصرے میں چونکہ تنقیدی محاکمہ مقصود نہیں، اس لیے سطورِ بالا پر اکتفا کرتے ہوئے ہم یونی ورسٹی آف گجرات کے متعلقین، خاص طور پر وائس چانسلر پروفیسر ڈاکٹر محمد نظام الدین کو مبارک باد پیش کرتے ہیں کہ شیخ عبدالرشید کی زبان و بیان کی خوبیوں کو صفحہ قرطاس پر منتقل کر کے یونی ورسٹی آف گجرات کی ایسی فکری و تصنیفی نیو رکھ دی گئی ہے جس پر کھڑی ہونے والی عمارت بلا مبالغہ بہت شاندار پرشکوہ اور نہایت عظیم ہوگی۔

(تبصرہ نگار: پروفیسر میاں انعام الرحمٰن)

''انصاف کرو گے؟''

ترجمہ کرنا مشکل کام ہے اور کوئی مشکل پسند ہی ترجمانی کا حق ادا کر سکتا ہے۔ ہر پس ماندہ قوم کی تاریخ میں ایسے مشکل پسند جنم لیتے رہے ہیں جو اپنی، ذہنی اعتبار سے پس ماندہ قوم تک ترقی یافتہ مہذب اقوام کے علوم وفنون کو ترجمہ کے ذریعے منتقل کرنے کا کٹھن فریضہ سرانجام دیتے رہے ہیں۔ اگر بات ایسی قوم کی ہو جس کے اپنے (معدودے چند) رجحان ساز رویے غیر ملکی زبان کے طلسم کا شکار ہوں تو ترجمانی کی ضرورت، ضرورت سے بڑھ کر فرضِ کفایہ کے درجے تک پہنچ جاتی ہے۔ وطن عزیز میں زبان کے حوالے سے مقتدر طبقے کی مخصوص چال نے ایسے مخصوص چلن کو رواج

دے رکھا ہے جس کے باعث اوسط ذہنی سطح کے حامل کسی فرد تک رجحان ساز رویوں کی پرچھائیں بھی نہیں پہنچ پاتی جس کے نتیجے میں رجحان ساز رویوں کا نوخیز پودا تناور درخت بننے سے بہت پہلے دم توڑ جاتا ہے۔ ایسے قابلِ افسوس (بلکہ قابلِ ماتم) تناظر میں، چودھری محمد یوسف ایڈووکیٹ نے قومی عدالتی پالیسی اور چند اہم مقدمات کا بروقت ترجمہ کر کے نئی ابھرتی ہوئی رجحان ساز قومی فکر کو عام قاری تک پہنچانے کا قابلِ تحسین کارنامہ سرانجام دیا ہے۔

''انصاف کرو گے؟'' زیرِنظر مترجم تالیف کا عنوان ہی نہیں ہے بلکہ ایسا سوال ہے جس کی درستی میں اس کا جواب بھی پنہاں ہے۔ جی ہاں! یہ ایک درست سوال ہے اور اس کے درست جواب میں ہماری قوم کے خوابوں کی تعبیر پوشیدہ ہے۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران میں برطانوی وزیرِاعظم چرچل نے بھی ایک درست اٹھائے گئے سوال کا درست جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ برطانوی قوم محکوم و مغلوب قوم نہیں بن سکتی، کیونکہ برطانوی عدالتوں میں انصاف ہوتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ بحیثیت قوم ہم اس وقت حالتِ جنگ میں ہیں اور اس وقت فقط انصاف ہی محکومیت و مغلوبیت کی راہ میں حائل ہو کر ہماری آزادی کے تحفظ کے لیے مضبوط فصیل کا کام دے سکتا ہے۔ لہٰذا ''انصاف کرو گے؟'' جیسا درست سوال بروقت اٹھانے پر چودھری محمد یوسف ایڈووکیٹ مبارک باد کے مستحق ہیں۔

فہرست پر سرسری نظر دوڑانے سے ہی عیاں ہو جاتا ہے کہ اس مترجم تالیف کے مشتملات میں نامیاتی تعلق تو سرے سے موجود نہیں، اس پر مستزاد یہ کہ کسی قسم کا منطقی ربط بھی بالکل نہیں پایا جاتا۔ ایسا الجھاؤ یہ سوال پیدا کرتا ہے کہ چودھری صاحب کو مختلف النوع مقدمات اور طبع زاد تحریروں کو ایک ہی کتاب میں سمونے کی کیوں سوجھی؟ ہمارے خیال میں اس سوال کے جواب کا تعلق مترجم مولف کی شخصیت کے شعوری پہلو سے نہیں ہے۔ اسے سمجھنے کے لیے اردو ادب کی صنف، غزل کی ماہیت کا تفہم کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔ غزل کے اشعار میں عام طور پر کوئی منطقی یا معنوی ربط نہیں ہوتا۔ ہر شعر دوسرے سے مختلف اور اپنی جگہ مکمل وحدت کا حامل ہوتا ہے۔ مثلاً میر تقی میر کی ایک مشہور غزل کے دو اشعار دیکھیے:

ہستی اپنی حباب کی سی ہے
یہ نمائش سراب کی سی ہے
نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

معنوی بعد کے باوجود، بہرحال دونوں ایک ہی غزل کے شعر ہیں اور بیان و معانی کے لحاظ سے اپنے اپنے مقام پر مکمل وحدت اور الگ الگ شناخت لیے ہوئے ہیں۔ غزل کی اس داخلی پیچیدگی نے ناقدین کو اس امر پر مجبور کیا ہے کہ وہ ''وہ چیز'' تلاش کریں جو ان مختلف وحدتوں کو ایک لڑی میں اس طرح پروتی ہے کہ غزل بن جاتی ہے اور کسی کو اس پر اعتراض بھی نہیں ہوتا۔ تلاش کے اس عمل میں ظاہر بین نقاد ردیف، قافیہ، وزن، بحر وغیرہ کے پلڑے میں ناپ تول شروع کر دیتے ہیں، لیکن گہرائی سے دیکھنے والے اسے شاعر کے ''موڈ'' کا نام دیتے ہیں کہ شاعر کا موڈ غزل کے پیچھے